1

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہماری نمازیں اور روزے بے نتیجہ کیوں ہیں؟

پرویز

سلیم! میرے مضامین پڑھ کر جو خیالات تمہارے دل میں پیدا ہوئے وہ بالکل فطری ہیں اور ہر اس شخص کے دل میں پیدا ہونے چاہئیں جو قرآن کریم کا خالی الذہن ہو کر مطالعہ کرتا ہے اور جس کی نگاہ ان حقائق کی متلاشی ہوتی ہے جنہیں خدا نے اس کتاب مبین میں بے نقاب کر کے رکھ دیا ہے اور جو قوموں کی تباہی و بربادی اور فوز و فلاح کے لئے غیر متبدل اور اٹل قوانین ہیں۔ تم میرے مسلک سے واقف ہو۔ میں قرآن کو مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ تمام نوع انساں کی انفرادی اور اجتماعی مشکلات کا واحد حل اور زندگی کے مصائب و آلام کا حتمی علاج سمجھتا ہوں اور میرا یہ عقیدہ محض خوش فہمی پر مبنی نہیں بلکہ میں علیٰ وجہ البصیرت اس کا یقین رکھتا ہوں' ایسا یقین جو وجہ طمانیت قلب اور باعث تسکین روح ہوا کرتا ہے' نہ کہ توہم پرستی کا پیدا کردہ فریب نفس جسے یقین اور اطمینان کا نام دے دیا جاتا ہے۔

تم پوچھتے ہو' اور ایسا پوچھنے میں تم بالکل حق بجانب ہو' کہ جب مسلمانوں کی ایک کثیر جماعت آج نمازیں بھی پڑھتی ہے' روزے بھی رکھتی ہے' زکوٰۃ بھی دیتی ہے' حج کا فریضہ بھی ادا کرتی ہے' تو ان اعمال کا وہ نتیجہ مرتب کیوں نہیں ہوتا جو عہد محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ (حضور نبی اکرمؐ اور صحابہؓ کے عہد) میں ہوتا تھا۔ چونکہ تم فلسفیانہ موشگافیوں اور منطقیانہ اصطلاحات میں الجھنے کے عادی نہیں' اور نہ ہی یہ طریق ان حقائق کو سمجھنے کے

2

لئے چنداں مفید ہوتا ہے' اس لئے تمہیں کھلے کھلے الفاظ میں بتانا چاہتا ہوں کہ آج ہمارے یہ ''اعمالِ حسنہ'' کیوں بے نتیجہ رہتے ہیں۔

سلیم! ذرا غور کرو کہ جاڑے کا موسم ہے۔ سخت سردی کا دن۔ شام کے قریب' جبکہ آفتاب کی شعاعوں میں تمازت باقی نہیں رہی' رحمت کی بیوی اپنے خوردسال بچوں کو لے کر اپنی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بیٹھی ہے۔ رحمت کی بیوی کو تم جانتے ہو؟ تم بچپن میں ان کے ہاں کھیلنے جایا کرتے تھے۔ عمر کا تقاضا تھا کہ اس کے چہرے پر شگفتگی و شادابی ہوتی۔ لیکن مسلسل فاقوں نے اسے ایسی افسردگی اور پژمردگی میں بدل دیا تھا کہ وہ ایک اجڑا ہوا بہشت معلوم ہوتا تھا جس پر سوائے نورِ عصمت کے (جو ہر ایسی پاک دامن بی بی کے چہرے پر ہونا چاہئے) رونق اور زندگی' تازگی اور بشاشت کا کوئی نشان تک باقی نہ تھا۔ ہاں! وہ اپنے بچوں کو لے کر چولہے کے قریب آ بیٹھی۔ خشک ٹہنیاں' سوکھے ہوئے پتے' خس و خاشاک' دوپہر کو اکٹھا کر لائی تھی۔ انہیں سلگا دیا تاکہ بچے آگ تاپتے رہیں۔ لیکن بچوں کو تو سردی سے زیادہ بھوک ستا رہی تھی۔ اس نے ان کے پیہم معصوم تقاضوں سے مجبور ہو کر ہنڈیا میں خالی پانی ڈال کر چولہے پر چڑھا دیا اور یوں' ان ننھے بچوں کو نہیں! خود اپنے آپ کو فریب دے لیا۔ ہر آہٹ پر کان اور ہر جنبش پر نگاہ تھی۔ بچے اور ان کی ماں رہ رہ کر گلی کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ سورج ڈوب گیا تو گلی کے دوسرے کنارے سے رحمت آتا دکھائی دیا۔ ننگے پاؤں' پنڈلیاں گرد و غبار سے اٹی ہوئی' گھٹنوں تک پرانا تہمد' پھٹا ہوا گاڑھے کا کرتا جس کی آستینیں بوسیدہ ہونے کی وجہ سے کہنیوں تک چڑھا رکھی تھیں۔ بس' اس شدت کے جاڑے میں یہی کل کائنات' چہرے پر زردی چھائی ہوئی' ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئیں' گھر کی طرف قدم اٹھاتا' لیکن قدم بمشکل اٹھتا۔ دروازے کے قریب آیا تو بیوی نے خاموشی سے بسم اللہ کہہ کر استقبال کیا۔ دونوں بچے ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ بیوی نے ایک حسرت بھری نگاہ میاں کے افسردہ چہرے پر ڈالی۔ اس کی غم آلود آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا کہ مجھے تو آج بھی کہیں مزدوری نہیں ملی۔ دن بھر ادھر ادھر پھرتا' لوگوں کی منتیں خوشامدیں کرتا رہا لیکن کوئی کام نہ مل سکا۔

عین اس وقت سامنے کی مسجد میں خواجہ صاحب کی طرف سے دو ہزار روپے کا گراں بہا قالین بچھایا جا رہا تھا اور نمازی اسلام کی شوکت و عظمت پر ایک دوسرے کو

مبارک باد اور خواجہ صاحب کو جنت کی بشارتیں دے رہے تھے۔

☆☆☆

سلیم! تم عنایت اللہ کو جانتے ہو نا! وہ تمہارے ساتھ پڑھا کرتا تھا۔ کس قدر ذہین اور کیسا شریف بچہ تھا؟ لیکن بچپن میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس کی ماں دن بھر محنت مزدوری کرتی اور بچہ کی پرورش کا سامان مہیا کرتی۔ لیکن جب مزدوری مردوں کو نہ مل سکے تو عورتوں کو مزدوری کہاں سے ملے؟ میں نے اپنی کھڑکی سے دیکھا کہ صبح مدرسے جاتے وقت ماں نے بچہ کو چھاتی سے لگایا۔ آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔ لیکن دل کو کڑا کر کے بیٹے کو تسلی دی کہ مدرسے سے ہو آؤ۔ بس تمہارے آنے پر روٹی تیار ملے گی۔ میں ابھی پکاتی ہوں۔ جاؤ میرا بیٹا! خدا حافظ!

سلیم! اگر ہمت ہو تو اس ماں کے دل کی گہرائیوں میں اتر کر دیکھو کہ بیٹے کو یوں بھوکا مدرسے بھیجتے وقت اس کے سینے میں کس قیامت کے جذبات غم و حزن کا طوفان برپا ہو گا۔ وہ غربت و فلاکت کا مجسمہ چپکے سے مدرسے چلا گیا۔ شام کو آیا۔ ماں گھر پر نہ تھی۔ شاید دانستہ باہر چلی گئی ہو گی کہ بھوکے بیٹے کو کس طرح دیکھ سکے؟ عنایت اللہ نے اندر آ کر سب سے پہلے روٹی والے رومال کو کھولا تو اس میں کچھ نہ تھا۔ خاموش باہر چلا گیا۔ گلی میں سے گزر رہا تھا کہ سامنے خان صاحب کے مکان میں سینکڑوں مسلمانوں کا اجتماع تھا۔ متنوع پھل، قسم قسم کی مٹھائیاں میزوں پر چنی رکھی تھیں کہ آج خان صاحب کے بچے کی پہلی افطاری کی تقریب تھی۔ یہ دو وقت کا بھوکا یتیم انہیں دیکھتا ہوا چلا گیا کہ چوک میں کچھ بوجھا مل جائے تو ایک پیسے کے چنے لے سکے۔

☆☆☆

سلیم! تم نے مائی بھولی کو دیکھا ہے؟ وہ اندھی بڑھیا جو پاگل ہو رہی ہے۔ لیکن تم نے اس کے بیٹے کو شاید نہیں دیکھا۔ اٹھارہ سال کا نوجوان بیٹا۔ اس کا باپ مدت ہوئی چالی پر سے گر کر مر گیا تھا۔ عمارت بنوانے والے نے دوسرے دن اور مزدور کام پر لگا لیا اور کسی کو خبر تک بھی نہ ہوئی کہ کس کا سہاگ لٹ گیا اور کون یتیم ہو گیا۔ اس بچہ کو مائی بھولی نے بڑی مشقت سے چرخہ کات کات کر پالا تھا۔ جس سال بڑے زور کا انفلوئنزا پھیلا تھا، وہ لڑکا بھی بیمار ہو گیا۔ محلہ میں ایک حکیم جی تھے۔ وہ غریبوں کو نسخہ مفت لکھ دیا کرتے تھے۔ بھولی وہاں سے نسخہ تو لکھوا لائی لیکن اٹھنی کے پیسے پاس نہ تھے کہ دوائی خرید سکے۔ سلیم! باور کرو کہ اس نے محلے کے ایک ایک گھر میں جا کر منتیں کیں کہ کہیں سے کچھ پیسے

قرض مل جائیں۔ لیکن کسی نے کچھ نہ دیا۔ نسخہ ہاتھ میں تھا اور سامنے جوان بیٹا جان توڑ رہا تھا۔ بچارا تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ یہ اس دن کا واقعہ ہے جس دن حاجیوں کی اسپیشل ٹرین روانہ ہوئی تھی اور سینکڑوں روپوں کے پھول اسٹیشن پر بکھرے پڑے تھے۔

☆☆☆

اور تم نے رضیہ بچاری کا پیغام تو اگلے دنوں خود اپنے کانوں سے سن لیا تھا۔ ذرا اندازہ لگاؤ کہ اسے جوان بھائی کے مرنے کی اطلاع ملتی ہے لیکن اس کے پاس اتنے کپڑے نہیں کہ تن ڈھانپ کر گھر کی چار دیواری سے باہر نکل سکے۔ جب اس نے کپڑے بھی مستعار مانگے تھے تو ظاہر ہے کہ بچاری کے پاس زادِ راہ کیا ہوگا۔ اس نے گاؤں کے چوکیدار کو کہلا بھیجا کہ وہ اس کے ساتھ جائے لیکن جب اسے معلوم تھا کہ رضیہ کے پاس کچھ نہیں تو وہ بلا اجرت کیسے ساتھ چلا جاتا؟ گاؤں میں دور نزدیک کے رشتہ دار بھی تھے لیکن کسے فرصت تھی کہ اس کی مصیبت میں اس کے ساتھ ہو لے؟ سارا گاؤں فتو خاں نمبردار کے لڑکے کی شادی کی تیاری میں مصروف تھا۔ غریب اکیلی، چلچلاتی دھوپ میں پیدل روانہ ہو گئی کہ مرنے والے کا منہ تو دیکھ لے۔ (یہ وہی رضیہ تھی جس نے بچپن میں اپنے مرحوم باپ کی معیت میں جو (''شمس العلماء'' تھے) دو حج کیے تھے)۔ اور یہ اس گاؤں کا واقعہ ہے جس کے مسلمان مذہبی معاملات میں اپنے کٹر پن میں مشہور ہیں۔ لیکن وہ ''مذہبی معاملات'' کیا ہیں؟ ذرا سن لو۔ مقلد اور غیر مقلد کے جھگڑے تو وہاں شروع سے چلے آتے تھے۔ اس دفعہ جو میں وہاں گیا ہوں تو ایک اور جھگڑا سننے میں آیا۔ خود مقلدوں کے ہاں بھی دو پارٹیاں بن رہی تھیں اور آپس میں سر پھٹول تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک ''عظیم الشان'' مسئلہ کے اختلاف کی وجہ سے یہ تنازعہ پیدا ہوا ہے۔ کہیں سے ایک مولوی صاحب تشریف لائے۔ یہ مولوی صاحب بقول ایک گروہ کے

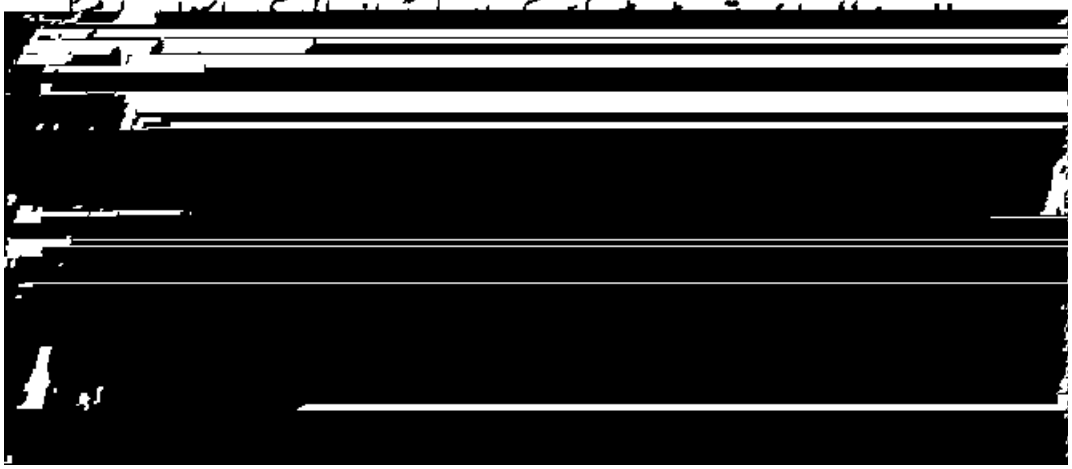

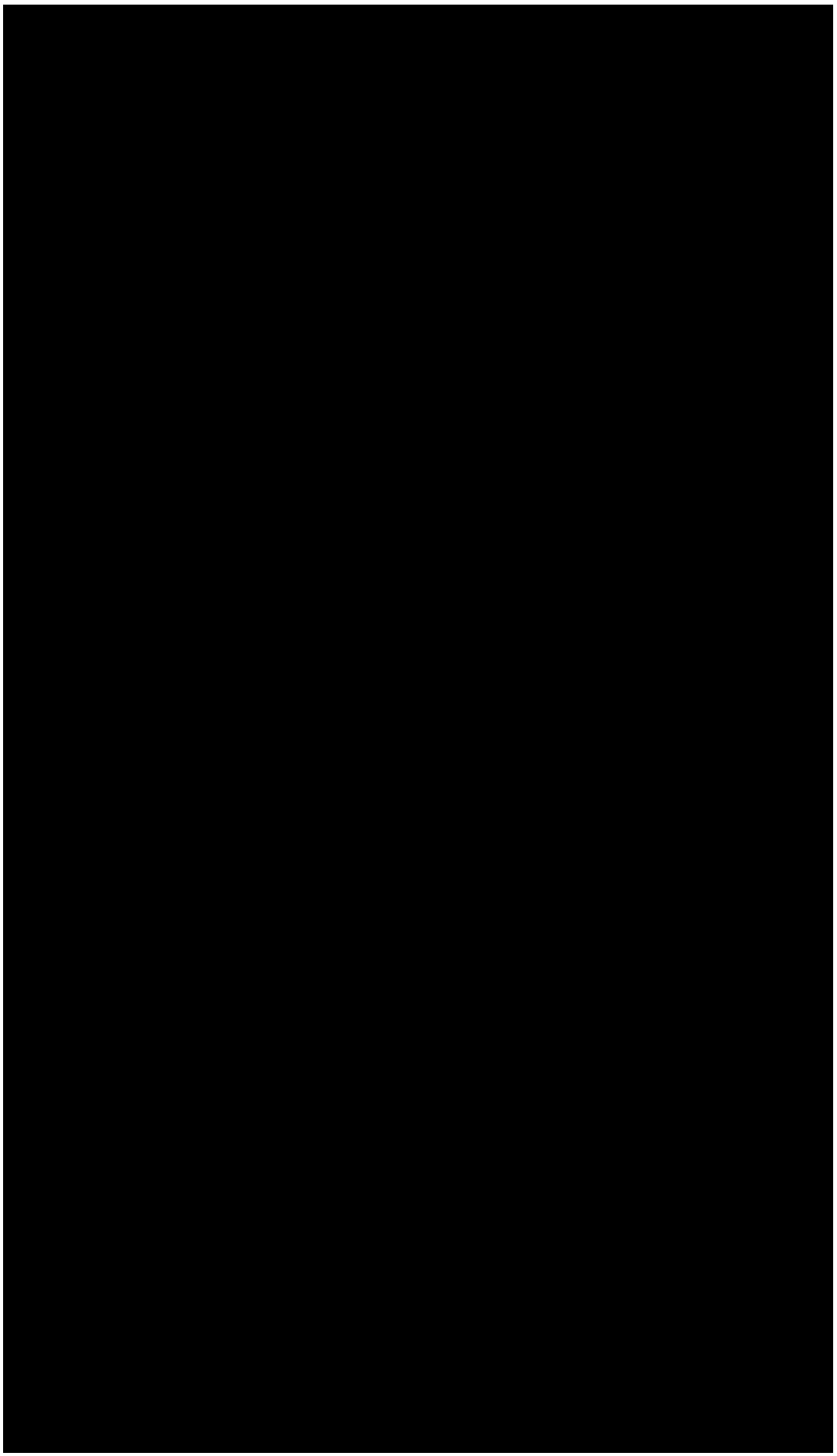

(سوسائٹی) قائم کرنا چاہتا ہے جو نوع انسان کی ربوبیت (پرورش) کا ذمہ لے۔ اس مقصد عظیم کے لئے اسلام ہر عبد مومن کو اس کارگہ حیات کی عظیم الشان مشینری کا اہم اور کارآمد پرزہ قرار دیتا ہے جس کی ہر حرکت اور جنبش کا اثر تمام مشینری پر پڑتا ہے۔ اگر ہر پرزہ اپنی اپنی جگہ صالح (محکم اور درست) ہے تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ مشینری بھی ایک ضبط و ربط کے ماتحت چلے اور اس کا جیتا جاگتا نتیجہ گھڑی کے ڈائل کی طرح سامنے آ جائے۔ لیکن اگر یہ پرزے الگ الگ پڑے رہیں تو خواہ ان میں سے ہر ایک پرزہ الماس و یاقوت کا کیوں نہ ہو' مشینری بیکار ہو جائے گی۔ آج ہماری مشینری بیکار ہو رہی ہے اور یہ نتیجہ ہے اس عملی رہبانیت کا جو مسلمانوں کے عقائد و اعمال میں سرایت کر چکی ہے۔ سلیم! غور سے قرآن کریم کا مطالعہ کرو تو تم پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی کہ کسی قوم پر ذلت و مسکنت اور افلاس و نکبت کا چھا جانا اور پھر اس قوم کا اس حالت پر مطمئن ہو جانا' خدا کا غضب ہے' اللہ کا عذاب ہے۔ اور یہ تو تم سمجھتے ہی ہو کہ ایک مغضوب علیہ قوم محض بے روح نمازوں اور رسمی روزوں کے بل بوتے پر اپنے آپ کو منعم علیہ قرار نہیں دے سکتی۔ جب اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ایمان اور عمل صالح سے استخلاف فی الارض کی زندگی عطا کرے گا تو ظاہر ہے کہ جس ایمان و عمل کا نتیجہ شوکت و عظمت' تمکن و استخلاف نہیں (یا وہ اس حالت کی طرف رفتہ رفتہ نہیں لئے جا رہے) وہ ایمان' ایمان اور وہ عمل' عمل صالح نہیں ہو سکتا۔ اس کے سوا تم کسی اور نتیجے تک پہنچ ہی نہیں سکتے' کیونکہ اللہ کے وعدے تو بہر حال سچے ہیں اور اس کا قانون اٹل۔ سلیم! ذرا انسانیت کے معراج کبریٰ' یعنی دور رسالت کی تاریخ پر نگاہ ڈالو۔ وہ کون سا خاص پروگرام تھا جسے کانفرنسوں اور انجمنوں نے مرتب کر کے قوم کے سامنے رکھا تھا؟ یہی نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ ہی تو تھا جس نے چند سال کے عرصے میں نہ صرف اس قوم کی تمدنی' اخلاقی اور معاشرتی حالت ہی میں انقلاب پیدا کر دیا' بلکہ ان کی معاشی اور اقتصادی زندگی کی بھی کایا پلٹ دی اور کھجوروں کے ستو کھا کر گزارہ کرنے والی قوم' قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کی وارث بن گئی۔ ان ہی سیدھے سادے اعمال نے ان کے اندر وہ انقلاب پیدا کر دیا جو ایک مرد مومن کی نگاہ میں تقدیریں بدل دینے والی قوت پیدا کر دیتا ہے۔ یہ اس لئے کہ یہ تمام اعمال درحقیقت مختلف اجزاء تھے اس پروگرام کے جس کا عنوان (یعنی مقصود آخر) قرآن کے پہلے چار الفاظ پر مشتمل ہے۔ یعنی **الحمد للہ رب العلمین** ۔ وجہ ستائش اللہ کا وہ پروگرام (نظام) ہے جو دنیا میں خدا کی ربوبیت عامہ (نوع انسان کی پرورش و تربیت) کا مظہر ہے۔ لہٰذا' جو

عمال اس نظام کے قیام کا ذریعہ نہیں بنتے وہ بے روح رسموں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتے۔

☆☆☆

سلیم! ایک مرتبہ اس حقیقت کو پھر سمجھ لو کہ میرا مقصد یہ نہیں کہ اعمال اسلامی کا ماحصل محض اسی دنیا کی فلاح و کامیابی' غلبہ و تسلط ہے۔ ہرگز نہیں۔ اگر ایسا ہو تو پھر خدا کی بادشاہت اور فرعون کی حکومت میں فرق کیا ہوا؟ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اعمال اسلامی کا لازمی اور فطری نتیجہ اس دنیا میں حکومت و سطوت اور شوکت و عظمت کی زندگی بھی ہے اور اس کے بعد کی دنیا میں سرخروئی اور آبرومندی کی زندگی بھی۔ اگر ہمارے اعمال اس دنیا میں شوکت و عظمت پیدا نہیں کرتے تو ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ ہمارے اعمال اسلام کی میزان میں پورے نہیں اترتے۔

☆☆☆

سلیم! تم پوچھتے ہو کہ بالآخر یہ عذاب کی زندگی ہم پر مسلط کیوں ہو گئی۔ حیران ہوں کہ تم اب تک اتنی سی بات بھی نہ سمجھ سکے۔ اس سے تم متفق ہو گے کہ قرآن کا مقصد لوگوں کو تمام خود ساختہ سلاسل و اغلال سے آزاد کر کے ان سے صرف قانون خداوندی کی اطاعت کرانا تھا۔ لیکن سلیم! تم ذرا اپنی تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھو کہ جس انسانی استبداد کو مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا' کن کن شاہراہوں سے وہی استبداد امت پر مسلط کیا گیا۔ اور قیامت یہ کہ اس استبداد کا تسلط بیشتر مذہب کی آڑ میں ہوا اور ہر وہ طوق جسے اتار پھینکنے کے لئے قرآن آیا تھا اسے عین اسلامی بنا کر مسلمانوں کے گلے میں ڈال دیا گیا۔ تم سمجھتے ہو کہ خدا کی میزان میں یہ جرم کچھ ایسا کم وزنی تھا کہ یونہی معاف کر دیا جاتا؟ امم گذشتہ جن جرائم کی پاداش میں ذلت و مسکنت کے عذاب میں گرفتار ہوئی تھیں' کیا وہ اسی قسم کے جرائم نہ تھے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ فطرت کسی کی سوتیلی ماں ہے کہ وہ ایک بچے کے ساتھ ایک قسم کا اور دوسرے کے ساتھ دوسری قسم کا سلوک کرے گی۔ اس کے قانون اٹل ہیں اور ان کا ہر ایک پر یکساں طور سے اطلاق ہوتا ہے۔ پہلوں نے یہی کچھ کیا تو ان پر عذاب آیا۔ جب مسلمانوں نے بھی وہی کچھ کیا تو ان پر عذاب کیوں نہ آتا؟ ان پر تو بلکہ اور بھی زیادہ سختی سے عذاب آنا چاہئے تھا کہ ان کے پاس قانون خداوندی کا ضابطہ اپنی اصلی اور مکمل شکل میں راہ نمائی کے لئے موجود تھا' لیکن انہوں نے اسے پس پشت ڈال دیا۔ کیا اس کی سزا اس سے کچھ مختلف ہونی چاہئے؟ انہیں وراثت کتاب کے لئے منتخب کیا گیا۔ نوع انسان کے لئے بہترین امت قرار دیا گیا۔ لیکن سب ایمان و عمل کے بدلے

میں' نہ صرف نام رکھوانے کے عوض۔ اس کے باوجود تم پوچھتے ہو کہ اس قوم پر خدا کا عذاب کیوں مسلط ہوا؟ سلیم! اخوت' مساوات' حریت' وحدت انسانی' جماعتی زندگی' مرکزیت' اطاعت' فرد کا ملت کے لئے سب کچھ کرنا اور ملت کا افراد کی ربوبیت کا سامان فراہم کرنا۔ یہ تھیں نظام حقیقی کی خصوصیات۔ تم دیکھتے ہو کہ مسلمان اس منشاء الٰہی کو کب سے بھولے ہوئے ہیں۔ چھوڑ دو ابتدائی دور ہمایوں کے مختصر سے زمانے کو اور اس کے بعد قرآن کریم کی کسوٹی سے پرکھتے جاؤ امت مسلمہ کے ایک ایک عمل کو۔ حقیقت تمہارے سامنے بے نقاب ہو جائے گی۔

لیکن بایں ہمہ' عزیزم! ہمارے لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ جس قرآن کی رو سے ایک مرتبہ وہ نظام قائم ہوا تھا وہی قرآن آج بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ اگر آج بھی مسلمان اس نکتہ کو سمجھ لیں تو پھر دیکھو ان کی نمازیں اور ان کے روزے کس طرح وہی نتائج پیدا کرتے ہیں جن کے دیکھنے کے تم اور ہر دردمند مسلمان متمنی ہے۔ **وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ وَ لٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۹۶/۷)**

''اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور قوانین خداوندی کی نگہداشت کرتے تو ہم ان پر زمین و آسمان کی برکات کے دروازے کھول دیتے۔ لیکن انہوں نے قوانین خداوندی کی صداقت کو جھٹلایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے قانون مکافات نے انہیں ان کے اعمال کی وجہ سے پکڑ لیا۔'' اس ایمان و تقویٰ کی حقیقت تمہیں قرآن کریم سے ملے گی' بشرطیکہ تم اسے' تمام غیر قرآنی تصورات کو ذہن سے نکال کر سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس لئے کہ ؎

کھویا گیا جو مطلب ہفتاد و دو ملت میں
سمجھے گا نہ تو جب تک بے رنگ نہ ہو ادراک

(اقبال)

والسلام (نومبر ۱۹۳۹ء)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆